اِسلام کا فلسفۂ اخلاق

جناب محمد فاروق خان صاحب - انڈیا

اخلاق کے سلسلے میں جب ہم اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں جو کامل، مستند اور خدا کی طرف سے آیا ہوا آخری دین ہے، تو ہمیں ان سارے ہی سوالات کا کافی وشافی جواب مل جاتا ہے جو اخلاقیات کے مطالعہ میں اُبھر کر ہمارے سامنے آتے ہیں — یہاں ہم کو خیر وشر، نیک وبد، صحیح اور غلط کا واضح علم ہوتا ہے۔ یہاں صاف الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ علم کا اصل ماخذ خدا کی ہدایت اور کتابِ الٰہی ہے۔ خدا نے جو قانونِ اخلاق عطا فرمایا ہے اس کے واجب الاطاعت ہونے کے لیے یہی بنیاد کافی ہے کہ وہ خدا کی طرف سے ہے۔ انسان کے لیے جس منتہا و مقصود کی ضرورت ہے وہ خدا کی ذات اور رضائے الٰہی کے علاوہ کوئی دوسری شے نہیں ہوسکتی۔ خدا کی ذات ہی وہ نفسِ اعلیٰ اور کامل ترین ذات ہے جو نفسِ انسانی کا ملجا وماویٰ قرار پاتی ہے۔ اگر خدا کی ہستی کے سوا کسی اور شے کو ہم منتہائے حیات اور غایتِ ہستی قرار دیتے ہیں تو یہ حق کے خلاف اور نفسِ انسانی پر ظلم ہوگا۔ نفسِ انسانی کو جیسا کہ پہلے واضح کیا جاچکا ہے، دوسری تمام اشیا کے مقابلہ میں فوقیت اور برتری حاصل ہے۔ اس لیے اس کا مقصود کوئی ایسی چیز ہرگز نہیں ہوسکتی جو شخصیت (PERSONALITY) کے وصف سے عاری ہو۔ اس لیے لازمی طور پر انسان کے جذبات واحساسات اور اس کی سعی وجہد کا رُخ خدا ہی کی طرف ہونا چاہیے۔ اس میں شبہ نہیں کہ تارے آسمان میں دیر تک چمکتے ہیں۔ چاند

ہماری تاریک راتوں کو منور کرتا ہے اور سورج سے روشنی اور تمازت حاصل ہوتی ہے، لیکن ہمارے دل کے نہاں خانے کے لیے ان کے پاس کوئی روشنی نہیں ہے اور نہ ہمارے دل کی گہرائیوں میں چھپی اُمنگوں کے لیے ان کے پاس کوئی گرمی ہے۔ کائنات میں جو بھی ہے خدا کا دستِ نگر اور محتاج ہے، اس لیے اس کے سوا کوئی نہیں جو ہماری زندگی اور ہماری تگ و دو کا اصل محور و مرکز قرار پا سکے۔

انسان کے لیے واضح فلاح اور خیر کی بات یہ ہے کہ وہ اس امتحان میں کامیاب ہو جس سے وہ دنیا میں دوچار ہے۔ جو طرزِ عمل اس بھلائی کے حصول میں مددگار ہو وہی درست ہے اور جو طرزِ عمل اس بھلائی کے حصول میں مددگار نہ ہو سکے، بلکہ اس کے حصول کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہو، وہ غلط ہے۔ خدا کی ہدایت ہی علم کا اصل ماخذ ہے۔ خدا کی محبت، اس کی رضا اور خوشنودی کی طلب اور اس کی ناراضی سے بچنے کی فکر اخلاق کی پابندیوں اور بُرے اخلاق سے اجتناب کے لیے اصل محرک ہے۔ خدا شناس افراد سے مل کر جو سوسائٹی اور صالح ریاست وجود میں آتی ہے جس کی تشکیل خدا کے دیے ہوئے قانون کی روشنی میں ہوتی ہے۔ اس کے اندر خود خدائی نظامِ اخلاق کے قیام کی طاقت ہوتی ہے۔ پھر قانون کی پابندی پر آمادہ کرنے کے لیے فرض شناسی کا احساس بھی پورے طور پر کام کرنے لگتا ہے اور حق سے محبت اور باطل سے نفرت کا جذبہ بھی اس سلسلہ میں محرک کا کام کرتا ہے۔

اسلام جزوی سچائیوں کی نفی ہرگز نہیں کرتا وہ سب کی سب اسلام کے اخلاقی نظام میں پیوست دکھائی دیتی ہیں۔ بجائے اس کے کہ وہ منتشر اجزا کی شکل میں یا ناقص حالتوں میں موجود ہوں اسلام انھیں محکم بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اسلام حصولِ کمال کی خواہش کو جسے فکرِ انسانی کی نظر میں ایک اخلاقی محرک کی حیثیت حاصل ہے، رد نہیں کرتا، بلکہ اسلام نے اس کی اہمیت کی تصدیق کی ہے۔ قرآنِ حکیم میں ارشاد ہے:

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ۝	اپنے خدائے برتر کے نام کی تسبیح کرو
الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّى ۝	جس نے خاکہ بنایا تو تناسب بھی قائم کیا
وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَى ۝	اور جس نے مقدر کیا تو رہنمائی بھی فرمائی

وَالَّذِیْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی ۝ اور جس نے سبزہ اُگایا تو اُسے
فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰی ۝ گھنا اور سرسبز و شاداب بھی کیا۔

(۸۷: ۱ — ۵)

مطلب یہ ہے کہ خدا نے پیدا ہی نہیں کیا، اچھی ساخت بھی عطا فرمائی۔ پھر اُس نے اچھی ساخت اور حُسنِ فطرت ہی نہیں بخشا بلکہ مقصود و غایت کی طرف رہنمائی بھی فرمائی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ زمین میں سبزہ اور گھاس اُگاتا ہے اور اس میں جو صلاحیتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ اُنھیں اُبھارنے اور ترقی دینے کا نظم بھی کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ننھے ننھے انکھوے بڑھ کر نہایت گھنے، شاداب اور خوشنما درخت ہو جاتے ہیں۔ اس قانون سے انسان کی زندگی الگ نہیں ہے۔ خدا نے انسان کو صرف زندگی ہی نہیں عطا کی، بلکہ وجود دے کر اس نے اسے اس کے مقصدِ وجود کا علم بھی بخشا۔ وہ انسان کو اس راہ کی طرف رہنمائی فرماتا ہے جس پر چل کر وہ اپنے حقیقی مقصدِ حیات کو پا سکتا ہے اور اپنی زندگی کو درجۂ کمال تک پہنچا سکتا ہے۔ اسلام ہماری زندگی کے نازک سے نازک پہلوؤں کا محافظ ہی نہیں ہے، بلکہ وہ اُن کو درجۂ کمال تک پہنچانا چاہتا ہے۔ انسان کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ وہ اپنی ذات اور اپنے نفس کو پامال کر دے اور تکمیل سے اُسے محروم رکھے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ کامیاب ہو گیا جس نے اُسے (اپنے نفس کو)
وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝ نکھارا۔ اور ناکام ہوا جس نے اُسے
(۹۱: ۹ — ۱۰) دبایا اور خراب کیا۔

انسان کی تکمیل حقیقت میں اپنے رب کی طرف بڑھنے ہی سے ہوتی ہے، خدا سے بے نیاز اور بیگانہ ہو کر انسان پستی میں جا گرتا ہے اور کامیابی کے بلند مرتبے پر پہنچنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔ اسلام نے اس کی پوری وضاحت کر دی ہے کہ انسان اپنی تکمیل کے لیے دنیا کے آزمائشی دور میں کون سا طرزِ عمل اختیار کرے۔ اس سلسلہ میں اسلام نے جو تعلیم دی ہے اس سے فرد ہی نہیں، جماعت، قوم اور پوری انسانیت ترقی کی طرف بڑھ سکتی ہے اور لوگ ایک دوسرے

کی تکمیل میں مزاحم ہونے کے بجائے مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

یہاں اس خوشی (PLEASURE) کی بھی نفی نہیں کی گئی ہے جس کا ذکر اخلاق کے مفکرین کے یہاں ملتا ہے، لیکن اس کے ساتھ اس بات کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے کہ خدا کی رضا کی طلب اور اس کے لیے سعی و جہد اور اس کے دیے ہوئے قانون کی پیروی بذاتِ خود سب سے بڑی خوشی کی چیز ہے۔ اسلام ذہن و دماغ اور دل کی ضرورتوں کو نظر انداز نہیں کرتا، بلکہ وہ انسان کے سارے ہی جذبات اور اس کی خواہشات کا احترام کرتا ہے، البتہ وہ اسی خوشی کو سندِ جواز عطا کرتا ہے، جو فطری اور احکامِ خدا کے تحت ہو۔ اخلاقی فرائض کی انجام دہی میں جو مسرت حاصل ہوتی ہے اُسے تو اسلام نے دین و ایمان کی علامت تک قرار دیا ہے، چنانچہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

إِذَا سَرَّتْكَ حَسَنَتُكَ	جب تمہیں اپنے اچھے کام کی خوشی ہو،
وَسَاءَتْكَ سَيِّئَتُكَ	اور اپنے بُرے کام سے تکلیف اور
فَأَنْتَ مُؤْمِنٌ۔ (احمد)	افسوس ہو تو تم مومن ہو۔

خوشی خواہ ذہنی ہو یا روحانی اور جمالیاتی۔ اگر اس خوشی اور دینی قدروں کے درمیان کوئی تصادم نہ ہو تو وہ معتبر ہے۔ اسلامی نظامِ حیات میں بھی اس کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے کہ فرد کی خوشی اور جماعت اور پوری انسانیت کی خوشیوں کے درمیان کوئی تضاد و تصادم پیدا نہ ہو۔

خدائی ہدایت کے ذریعے جو علم ہمیں حاصل ہوتا ہے وہی اصل علم ہے۔ دوسرے علوم خواہ وہ تجرباتی ہوں یا وجدانی، ان کی حیثیت اصل علم کے شواہد کی ہے۔ اخلاقیات کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ قوانینِ حیات، عقل و وجدان اور انسان کے تجربات سب کے سب خدائی ہدایت کے حق اور خیر ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔ اصل معیار خدا کی ہدایت ہے۔ حکماء کی تجویز کردہ چیزوں کی اس سے نفی نہیں ہوتی، بلکہ اس سے ان کی تصحیح و تکمیل ہوتی ہے۔ ان میں سے اگر کوئی چیز غلط حدود میں پہنچ گئی ہے تو خدا کی ہدایت میں اُسے ایک جامع نظام کے اندر اس کے اپنے ٹھیک مقام پر رکھا گیا ہے۔

یہ خیال قطعاً غلط ہے کہ اسلام میں اخلاق صرف جنت اور دوزخ کے تصور پر مبنی ہے۔ جنت اور دوزخ کا تصور اخلاق کی اصل اساس نہیں ہے، بلکہ یہ اخلاق کے آخری نتائج ہیں۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر کسی سے کہا جائے کہ کسی کا مال ہڑپ کرو گے تو جیل جانا پڑے گا، تو کیا اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اس کام کی برائی قید خانہ پر مبنی ہے۔ خود اس فعل میں کوئی برائی نہیں۔ اسی طرح اگر کسی سے کہا جائے کہ سچائی اختیار کرنے والے کو سوسائٹی میں عزت کا مقام حاصل ہوتا ہے تو کیا اس کا یہ مطلب لینا صحیح ہو سکتا ہے کہ سچائی کی اساس مقامِ عزت کا حصول ہے، سچائی اپنے اندر کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتی؟

قرآنِ حکیم نے خیر و شر کا ایسا نظریہ پیش کیا ہے جس کی بلندیوں کا تصور بھی عام ذہن نہیں کر سکتا۔ قرآن خیر کو "معروف" کہتا ہے یعنی اس کے نزدیک خیر وہ ہے جس سے انسان کی فطرت مانوس ہے۔ جو اس کی فطرت کے عین مطابق ہے۔ جسے وہ پہچانتی ہے۔ شر کو قرآن "منکر" کہتا ہے، یعنی شر اس کے نزدیک وہ ہے جس سے انسان کی فطرت ابا کرتی ہے۔ جو انسانی فطرت کے لیے اجنبی ہے۔ جس کو وہ جانتی نہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اسلام میں نیکی و بدی کی اساس انسانی فطرت پر قائم ہے۔ اس کے نزدیک نیکی یہ ہے کہ فطرت کے مطابق ٹھیک ٹھیک چلا جائے۔ مطلوب یہ ہے کہ انسان ترقی کر کے اس مرتبے کو پا لے جہاں دین کی کوئی چیز اس کی مرضی کے خلاف نظر نہ آئے۔ سب کچھ اس کی اپنی مرضی کے مطابق ہو۔ جنت کی تعریف میں قرآن میں فرمایا گیا ہے:

لَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ۔ (۴۱ : ۳۱)

تمہارے لیے وہاں وہ سبھی کچھ ہے جو تمہارا جی چاہے اور وہاں تمہارے لیے وہ سبھی کچھ ہے جس کی طلب تمہارے اندر ہو۔

اسلامی نقطۂ نظر سے فطرت کے خلاف عمل کرنے کا نام بدی ہے۔ اور اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ آدمی تنزل اور گراوٹ کے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں کوئی چیز مرغوب اور

پسندیدہ نہ پائی جائے۔ جو کچھ بھی ہو اُس کی مرضی کے خلاف ہو۔ جہنم ایک ایسا ہی مقام ہے، جس تک آدمی کو اس کی اخلاقی گراوٹ ہی پہنچاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اخلاق کی اصل بنیاد انسان کی اپنی فطرت کی پہچان اور اس کے مطابق عمل کرنا ہے۔ اخلاق کوئی خارجی شے نہیں، بلکہ وہ فطرتِ انسانی کا صحیح اظہار ہے۔ انسان اگر اپنے حقیقی جذبات و احساسات کو پہچان لے تو اخلاقی تقاضے اس کے اپنے دل کی اُمنگوں سے مختلف کوئی چیز نہیں ہیں۔ جب تک انسان اپنی حقیقی فطرت سے آشنا نہیں ہوتا وہ بُرائی سے خواہ بچ بھی جائے مگر اس کے دل و دماغ بدستور گنہگار رہیں گے۔

آدمی کی جیسی شخصیت ہوتی ہے اُس سے اعمال کا صدور بھی اسی طرح کا ہوتا ہے۔ کسی عمل کے پیچھے صرف جبلّی تحریک (MOTIVE) ہی کا دخل نہیں ہوتا، اس میں اس کا ذہن و فکر اور اس کی عقل بھی کام کرتی ہے۔ اس کے پیچھے اس کے آئیڈیل اور مقصدِ حیات کی بھی کارفرمائی ہوتی ہے، جس کو وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اختیار کئے ہوئے ہوتا ہے۔ اس پہلو سے اخلاق و کردار زندگی کا کچھ حصہ یا ارنلڈ (MATHEW ARNALD) کے خیال کے مطابق تین چوتھائی ہی نہیں ہوتا، بلکہ فطری طور پر وہ اس کی پوری زندگی پر حاوی ہوتا ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے بعض ایسی غیبی چیزیں بھی اخلاق کے لیے محرکات کا کام کرتی ہیں جن کا احساس عام طور پر لوگوں کو نہیں ہوتا۔ آدمی جب اپنی زندگی کو عالمِ غیب و بسیط سے جو عالمِ حقیقت ہے، ہم آہنگ کر لیتا ہے تو خدا کی طرف سے اُسے تائید و مدد حاصل ہونے لگتی ہے۔ اُسے علم و حکمت سے نوازا جاتا ہے۔ اُسے طمانیت اور سکینت حاصل ہوتی ہے۔ فرشتے بھی اس کے دل میں نیک خیالات و احساسات القا کرنے لگتے ہیں اور وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ خدا کی ایک اعلیٰ اور معصوم مخلوق کی معیت بھی اُسے حاصل ہے۔

انسانی حیات میں اخلاق کا نمایاں اظہار حقوق کی ادائیگی کی صورت میں ہوتا ہے۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے انسان پر سب سے پہلا اور سب سے بڑا حق اس کے خالق و مالک خدا کا ہے۔ خدا کے حقوق کی ادائیگی میں اس کی عبادت، پرستش، اطاعت وغیرہ ساری ہی چیزیں داخل ہیں۔ خدا کے بعد بندگانِ خدا کے حقوق ہیں، جن سے اس کے مختلف قسم کے تعلقات ہوتے ہیں۔

خدا کے بندوں میں سب سے نمایاں حق والدین کا ہوتا ہے کیونکہ والدین سے انسان کا تعلق انتہائی قریبی اور گہرا ہوتا ہے۔ پھر درجہ بدرجہ دوسرے لوگوں کے حقوق سامنے آتے ہیں۔ اِس سلسلہ میں کچھ تفصیل قرآن کی اس آیت میں ملتی ہے:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَۨا ۝ (۴:۳۶)

اللہ کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو، والدین، قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، پڑوسی، رشتہ دار اجنبی، ہمسایہ، پہلو کے ساتھی، مسافر اور جو تمہارے زیر دست ہوں، سب کے ساتھ نیک سلوک کرو، بلاشبہ اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا، جو مغرور اور ڈینگیں مارتا ہو۔

اس آیت میں والدین، اعزہ اور دوسروں کے ساتھ نیک سلوک کا حکم دیتے ہوئے خدا کی بندگی کا حکم دیا گیا ہے۔ اس میں اس بات کا اشارہ پایا جاتا ہے کہ جس طرح والدین، رشتہ داروں وغیرہ کے ساتھ نیک برتاؤ انسان کے لیے ایک اخلاقی اور فطری بات ہے، ٹھیک اسی طرح خدا کی اطاعت و بندگی کا مطالبہ بھی ایک فطری مطالبہ ہے، جس کا اخلاقِ انسانی سے گہرا تعلق ہے۔ دونوں طرح کے حقوق کی ادائیگی میں ایک ہی بنیادی اخلاقی اصول کام کرتا ہے۔ ان میں سے کسی ایک سے صرفِ نظر کرنا اس بنیادی اصول کی تردید کے ہم معنی ہے اور اس سے انسان خود اپنے اخلاق و کردار کو بھی صدمہ پہنچاتا ہے۔ بنیادی اخلاقی اصول زندگی کے تمام ہی شعبوں میں کام کرتا ہے خواہ زندگی کا سیاسی شعبہ ہو یا معاشی۔

اِن تفصیلات کی روشنی میں اس بات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اخلاقی فرائض کی ادائیگی محض کسی خارجی قانون کی پیروی کا نام نہیں ہے اور نہ ہی یہ آدمی کا کوئی ایسا اپنا ہے جو کسی اجنبی (ALIEN) طاقت کے لیے ہوئے بلکہ یہ تو ان اجزائے حیات کی فطرت

کے ساتھ ہمارے محض ہم آہنگ ہو جانے کا اظہار ہے جن سے انسانی شخصیت کی تعمیر و تشکیل ہوتی ہے، چنانچہ افلاطون (PLATO) نے کہا ہے:

VIRTUE WILL BE A KIND OF HEALTH AND BEAUTY AND GOOD HABIT OF THE SOUL: AND VICE WILL BE A DISEASE AND DEFARMITY AND SICKNESS OF IT.

"نیکی کو صحت اور حسن کی ایک قسم اور روح کی ایک اچھی فطرت کہا جائے گا۔ اور گناہ کو مرض اور روح کا بگاڑ اور اس کی بیماری قرار دیں گے"[1]

سچ ہے، نیکی کی تلاش اور گناہوں سے اجتناب بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی صحت کا طالب اور بیماری سے بچنے کی کوشش کر رہا ہو۔

---

[1] G. LOWES DICKINSON